تحقیقی مجلہ تصدیق
جلد۰۱ شمارہ۰۵، ۲۰۲۳

*Article*

# MIRZA GHALIB IN THE MIRROR OF HIS PERSIAN WORKS

# غالب اپنی فارسی تصانیف کے آئینے میں

**Dr. Ali Kavousi Nejad** *[1]

[1] University of Tehran. Department of Urdu Language &literature
*Correspondence: alikavousi7@ut.ac.ir

[1]ڈاکٹر علی کاوسی نژاد

[1]اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف تہران، شعبہ اردو

## ABSTRACT:

Mirza Asadullah Khan Ghalib is one of the famous poets of the sub-continent, who, in addition to mastering the Urdu language and literature, is also considered one of the leaders of his time in Persian poetry and prose. He is one of the poets who has an extraordinary power of imagination. Mirza Ghalib recounts the difficult story of his trip to Calcutta to revive the family pension he received from the British government in the form of poetry and prose in his Persian creations. Mirza Ghalib Dehlavi is among those who experienced the events of the 1857 revolution. He writes the events of fifteen months of this revolution in Persian prose under the name "Dastanbo". During this important event, his beloved brother Yusuf dies in bed and Mirza Ghalib becomes very sad. In his Persian poetry and prose, Mirza Ghalib considers his ancestors and nobles to be from the Turks of Aibek, and traces his lineage to Pashang and Afrasiab. In the field of historiography, his book "Mehr Nim Rooz" in Persian language deals with the history of the kingdom of the Mughal kings of India. Ghalib's collection of Persian poetry and prose represents the life of this famous poet of the Persian language in the subcontinent of that time. In this research, we examine Mizra Asadullah Khan Ghalib in the mirror of his Persian works.

**Keywords**: Mirza Asadullah Khan Ghalib, Persian poetry and prose, Sub-continent, Dastanbo, Mehr nim Rooz

**eISSN**: 2707-6229
**pISSN**: 2707-6210
Doi:https://doi.org/10.56276/tasdiq.v5i01.160
Received:15-06-2023
Accepted:25-06-2023
Online: 06-07-2023

**Copyright:** © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

مرزا اسد اللہ خان غالب معروف بہ مرزا نوشہ، خطاب نجم الدولہ، دبیر الملک اسد اللہ خان بہادر، نظام جنگ اردو میں اسدؔ تخلص کرتے تھے لیکن کچھ عرصے بعد جب غالب کو پتا چلا ایک اور غیر معروف شاعر اسدؔ تخلص کرتا ہے تو انھوں نے اپنا تخلص تبدیل کر دیا اور اس کے بعد سے وہ فارسی اور اردو دونوں میں غالب تخلص کیا کرتے تھے۔ غالب شب ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ /۲۷/ دسمبر ۱۷۹۷ء کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔(۱)

غالب نے اپنی ایک فارسی رباعی میں اپنی سنہ پیدائش کی یوں تاریخ نکالی ہے:

غالب کہ چون ناسازی فرجام نصیب　　ہم خوفِ عدو دارم و ہم ذوقِ حبیب

تاریخ ولادتِ من از عالم قدس　　ہم "شورشِ شوق" آمد و ہم لفظ "غریب"(۲)

"شورشِ شوق" اور "غریب" کے الفاظ سے وہی ۱۲۱۲ھ کے اعداد بر آمد ہوتے ہیں۔ ہر چند غالب کی یومِ پیدائش کے بارے میں مختلف آراء قائم ہوئی ہیں لیکن ہمارے لیے وہی مطلوب و مقصود ہے جو غالب اور ان کے جید شاگرد مولانا حالی نے اپنی کتاب "یادگار غالب" میں ذکر کیا ہے اور مالک رام نے بھی "ذکر غالب" میں بھی غالب کی سنہ پیدائش ۱۲۱۲ھ بتائی ہے۔

غالب اپنا سلسلہ نسب پشنگ اور افراسیاب تک بتاتے ہیں۔ غالب کے آبا و اجداد نسلاً ایبک ترک تھے، ان کے دادا قوقان بیگ خاں ولد ترسم خاں اپنے والد سے ناراض ہو کر شاہ عالم ثانی کے دور میں ہندوستان وارد ہوئے۔ قوقان بیگ خاں نے پہلے لاہور میں نواب معین الملک کی ملازمت اختیار کی، معین الملک کی وفات کے بعد وہ دہلی چلے گئے وہاں نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں سپہ سالار شاہ عالم نے انھیں اعلیٰ منصب پر مامور کیا۔(۳)

غالب اپنے ایک فارسی قطعے میں اپنے آبا و اجداد کے اعلیٰ منصب پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔(۴)

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم　　لاجرم در نسب فرہ مندیم

ترک زادیم و در نژاد ہمی　　بہ سترگان قوم پیوندیم

ایبکیم از جملۂ اتراک　　در تمامی زماہ دہ چندیم

فن آبای ما کشاورزیست　　مرزبان زادۂ سمرقندیم

مذکورہ بالا فارسی قطعے میں غالب اپنے آبا و اجداد کو ایبک ترک بتاتے ہیں۔ پہلے ان کے آبا و اجداد کھیتی باڑی کیا کرتے تھے، بعد میں انھوں نے سمرقند میں سپہ گری کو اپنا مشغلہ بنایا لیکن غالب نے اپنے اجداد کے برعکس سپہ گری چھوڑ کر فن شعر و شاعری کو اپنا سرمایہ بنایا۔ ایک فارسی رباعی میں واضح طور پر اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔(۵)

غالب بہ گہر زدودۂ زاد شمم

زان رو بہ صفای دم تیغست دمم

چون رفت سپہبدی زدم چنگ بہ شعر

شد تیر شکستہ نیاکان قلمم

غالب اس رباعی میں اپنا سلسلۂ نسب زاد شم تک بتاتے ہیں، جب سپہبدی اور سپہ گری کا موقع ہاتھ سے نکلا تو انھوں نے قلم کو اپنا سرمایہ بنایا، غالب اپنے ایک فارسی خط بنام مولوی سراج الدین احمد جو پنج آہنگ میں شامل ہے۔ اپنے آبا و اجداد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں مذکورہ خط کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

> ''ترک نژاد ہوں اور میرا سلسلہ نسب افراسیاب و پشنگ سے جاملتا ہے۔ اور میرے اجداد چوں کہ سلجوقیوں کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے۔ ان کے عہد حکومت میں سرداری اور سپہ سالاری کے جھنڈے اٹھاتے تھے۔ جاہ و مرتبت کے اختتام پر جب وہ گروہ ناکامی اور بے نوائی سے دوچار ہوا تو کچھ کو رہزنی اور لوٹ مار نے گمراہ کر دیا اور کچھ نے کاشت کاری کو اپنا پیشہ بنایا۔ میرے اجداد نے توران کے شہر سمرقند میں بود و باش اختیار کی۔ اسی زمانے میں میرے (پر) دادا نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر ہندوستان کا عزم کیا اور لاہور میں معین الملک کی رفاقت اختیار کی۔ جب معین الملک کی بساطِ (اقبال) بھی لپیٹ دی گئی، وہ دہلی آگئے اور ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خان کے متوسلین میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد میرے والد عبد اللہ بیگ خان دہلی میں پیدا ہوئے اور میں آگرے میں۔ ابھی میں پانچ سال ہی کا تھا کہ میرے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میرے چچا نصر اللہ بیگ خان چوں کہ چاہتے تھے کہ ناز و نعمت سے میری پرورش کریں لیکن موت نے مہلت نہ دی اور اپنے بڑے بھائی کی موت کے کم و بیش پانچ سال بعد انتقال کیا اور مجھے اس ویرانے میں تنہا چھوڑ دیا۔ اور یہ حادثہ کہ میرے لیے ایک جاں گدازی کی اور آسمان کے لیے ایک کمینگی کی علامت تھی، ۱۸۰۷ء میں صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک بہادر کی لشکر کشی اور کشورکشائی کے دوران پیش آیا۔۔۔''(۶)

جیسا کہ غالب نے اپنے فارسی خط بنام مولوی سراج الدین احمد میں لکھا ہے ان کا سلسلۂ نسب پشنگ اور افراسیاب تک جا پہنچا ہے۔ سلجوقیوں کے دورِ حکومت میں ان کے آبا و اجداد کاشت کاری کرتے تھے اور سمر قند میں ساکن تھے۔ ان کے دادا قوقان بیگ خان اپنے والد سے ناراض ہو کر ہندوستان آئے اور پہلے لاہور میں معین الملک کے ہاں ملازمت اختیار کی اور اس کے بعد ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر کے رسالے میں شامل ہوئے۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں شاہجہاں آباد میں متولد ہوئے لیکن غالب کی عمر پانچ برس کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اس کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے غالب کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی۔ بد قسمتی سے نصر اللہ بیگ خاں اپنے بھائی کی موت کے پانچ سال بعد ہاتھی سے گر کر فوت ہو گئے۔ اس کے بعد غالب بے سہارا ہوئے۔ غالب اپنے عمِّ محترم کے چلے جانے کے بعد اپنے نانا کی سرپرستی میں آ گئے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی آگرے میں بسر کی، غالب نے نوجوانی عیش و عشرت سے گزاری۔ مرزا کی شادی نواب فخر الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں کے ہاں قرار پائی اور تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی امراؤ بیگم سے طے پائی۔ غالب کی ازدواجی زندگی زیادہ ٹھیک نہ رہی اور وہ ہر وقت اُسے قید خانے سے تشبیہ دیتے تھے اسے اپنے لیے قید و بند سمجھتے تھے، غالب مزاجاً آزاد رہنا چاہتے تھے اور زندگی کی ذمہ داریوں سے فرار کا راستہ ڈھونڈتے تھے، مالی مسائل کے ٹھہراؤ نے انھیں سفر کلکتہ پر مجبور کیا اور اس طویل سفر میں وہ بہت سے مصائب سے دوچار رہے۔

غالب جس عہد میں پیدا ہوئے وہ عہد سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے افراتفری اور خلفشاری کا عہد ہے۔ سلطنت مغلیہ جو اکبری اور عالمگیری دور میں پر شکوہ اور شاندار عظمت کی حامل تھی۔ اب اس کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ایک طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی سازشوں سے اور انگریزوں کی بے جا مداخلت سے ملک میں افراتفری پھیل رہی تھی اور دوسری طرف ملک مختلف خانہ جنگیوں کی وجہ سے کمزور ہو رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان جو لمبے عرصے سے امن و سکون کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے، ان کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو رہی تھی، ملک میں اتحاد اور یکجہتی نہیں رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو ایک عرصے سے تجارت کی غرض سے ہندوستان آئی تھی، انھوں نے اپنے اپنے تمام اثر رسوخ استعمال کیے اور انگلستان کی پالیسیوں کا پرچار کرنے لگے۔ سامراجی قوتوں کا ایک جواز یہ تھا کہ وہ جس ملک میں سیاسی یا فوجی مداخلت کریں گے تو ان کا اصلی مقصد اس معاشرے کے معاشی اور تعلیمی نظام کو بہتر بنانا ہے، انگریز عرصۂ دراز سے ہندوستان میں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنے سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے اپنے قدم جمائے اور لوگوں کے ذہنوں پر مسلط ہوئے۔ ہندوستان کے بہادر حکمرانوں نے کئی محاذ پر انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ان میں سے سلطان ٹیپو کا نام سرِ فہرست ہے۔ جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑی لیکن اپنے سپاہیوں کی خیانت کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کر شہید ہوئے اور آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا۔ انگریز ملک کے کونے کونے پر قابض ہوئے، ہندوستان جو ایک زمانے میں ایک خوشحال ملک تھا اس کے ذخائر انگلستان کے کارخانوں کے لیے خام مواد فراہم کرنے کا

ذریعہ بن گئے۔ انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ اندرونی قوتیں بھی بر سرپیکار تھیں اور مغلیہ سلطنت صرف برائے نام رہ گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا قلعۂ معلّٰی میں محصور رہتے تھے اور زیادہ تر شعر وشاعری میں مصروف تھے۔ اس دور میں ملک کی بہتری اور خوشحالی کے لیے کوئی معاشی حکمت عملی سامنے نہیں آئی۔ بادشاہ کے خزانے میں اتنی دولت باقی نہیں رہی کہ سپاہیوں اور عوام کی فلاح وبہبود کے لیے منصوبے بنائے جائیں۔ یہ اس سلطنت کی صورتحال تھی جو کسی زمانے میں مختلف فارسی گو شعرا کی سرپرستی کررہی تھی۔ ایران میں صفویہ خاندان حاکم تھا۔ یہ ایک ایسی حکومت تھی جو شعرا اور ادبا کی سرپرستی کرنے سے معذور تھی، صفوی خاندان شعرا اور شعر وادب کے فروغ میں اپنے لیے فخر ومباہات محسوس نہیں کرتے تھے۔ جب ہندوستان میں مغلیہ عہد میں شعرا کو اچھی سرپرستی حاصل تھی تو ایران کے بڑے نامور شعرا ہندوستان کی طرف کوچ کر گئے اور یہاں آکر شاہی درباروں سے متوسل رہے، ان نامور شعرا میں عرفیؔ، نظیریؔ، طالب آملیؔ، حزینؔ اور دوسرے شعرا بھی شامل تھے۔ خود ہندوستان میں بھی فارسی شعرا جیسے امیر خسرو دہلوی، مسعود سعد سلمان گزر چکے تھے جو نہ صرف ریختہ شاعری کرتے تھے بلکہ فارسی شاعری کے میدان میں بھی سربرآوردہ اور مشہور ومعروف شعرا کی صف میں شمار کیے جاتے تھے۔ غالب اپنی شاعری میں امیر خسرو دہلوی کے بہت قائل تھے اور کسی حد تک نظیریؔ کی شاعری کو درخورِ اعتنا سمجھتے تھے۔ غالب حزینؔ کی طرح برصغیر کے فارسی گو شعرا کے قائل نہیں تھے بلکہ ایرانی شعرا کو زبان واسلوب کے لحاظ سے معیاری سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے غالب کو اپنی شاعرانہ تفاخر کی وجہ سے کئی حریفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ کلکتہ جیسے دور ودراز سفر پر روانہ ہوئے اور کلکتہ کے مختلف مشاعروں میں حاضر ہوئے تو واقفؔ و قتیلؔ کے شاگردوں اور پیروکاروں نے مرزا غالب کو بہت تکلیفیں دیں اور ان کے فارسی اشعار پر اعتراضات کرنے لگے۔ یہ اعتراضات غالب جیسے نازک مزاج شاعر پر گراں گزرے۔ غالب قتیلؔ و واقفؔ کی فارسی شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

غالب نے اپنی جوانی میں مختلف رنگ رلیوں میں گزاری، جب ان کے والد اور عمِ محترم کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور وہ بے سہارا رہ گئے تو اپنے نانا کی سرپرستی میں آ گئے۔ انھوں نے بچپن میں کبھی مالی لحاظ سے کمی محسوس نہیں کی۔ غالب کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی یعنی اس وقت جب وہ ابھی پوری طرح سے سنِ شعور کو نہ پہنچے تھے۔ اس لیے غالب اپنی ازدواجی زندگی میں کامیاب نظر نہیں آئے، پہلے یہ کہ وہ کم عمری میں تلاشِ معاش میں آگرے سے دہلی روانہ ہوئے اور دوسری کمی جو غالب کو عمر بھر ہمیشہ سے محسوس ہوتی تھی وہ یہ کہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ غالب نے کئی بار اپنے فارسی اشعار میں اپنی ازدواجی زندگی سے بیزاری اور ندامت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بات مدنظر ہونی چاہیے کہ غالب ہمیشہ اپنے اہلِ خانہ سے بے مروّتی اور ناانصافی سے پیش نہیں آئے۔ یہاں تک کہ اپنی خاندانی پنشن کے مسئلے کو سلجھانے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ غالب ایک خوددار اور رجائیت سے بھرپور شخصیت کے حامل تھے۔ اگر انھوں نے اپنے فارسی اشعار میں خاص طور پر فارسی قصائد میں کئی انگریز عمائدین اور افسروں کی مدح وستائش میں قصیدہ سرائی کی ہے تو اس لیے کہ وہ خاندانی پنشن کے قضیے کو بحال کرانے کے سلسلے میں ان لوگوں سے اپنے گہرے تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہاں ایک

دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کرنا نہایت ضروری ہے کہ غالب ایک متجدد شاعر اور مفکر تھے۔ انگریزوں کی ہندوستان کی آمد کے ساتھ ساتھ ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ مغرب کے اختراعی ذہن نے جدید سہولیات سے لیس معاشرے میں نئی ہل چل مچار کھی تھی۔ تیز رفتار دخانی کشتیاں جو گھنٹوں میں لمبی مسافتیں طے کرتی تھیں، ڈاک رسانی کا نیا نظام جو کم وقت میں ڈاک ملک کے مختلف گوشوں میں پہنچاتا تھا، تار برقی کے ذریعے منٹوں میں پیغامات منتقل کیے جاتے تھے۔ غالب جب کلکتہ پہنچے انگریزوں کی حکمت عملی سے متاثر ہوئے اور انھوں نے نئے نظام اور نئے نظم ونسق کی خوب داد دی، جب سر سید احمد خان نے غالب سے "آئین اکبری" کی تقریظ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو سر سید احمد خاں سے اپنی بڑی دیرینہ دوستی کے باوجود غالب نے ان کے اس تدوینی کام پر تنقید کی اور تقریظ اس ڈھب سے لکھی جس میں سر سید کی بدنامی کا پہلو سامنے آیا۔ اس لیے سر سید نے غالب کی لکھی ہوئی تقریظ کو "آئین اکبری" میں شامل نہیں کیا۔ یہاں یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ غالب نئے نظام کے حق میں تھے اور ایک روایت شکن شاعر کے طور پر سامنے آئے۔ ان کی فارسی شاعری میں بھی دوسرے فارسی شعراسے متاثر ہوتے ہوئے بھی جدت نظر آتی ہے۔ وہ اپنی فارسی مکتوب نگاری میں بھاری بھر کم اور ثقیل الفاظ وخطابات استعمال کرنے سے اپنی انشا نگاری کے فن کی برتری کا اظہار کرنا چاہتے تھے جو کبھی مشکل اور دقیق الفاظ اور عبارات استعمال کرنے کے باعث اصل مطلب و مدعا کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتی تھی۔ اس کے بالکل برعکس اردو مکتوب نگاری میں میرزا غالب سہل و آسان اسلوب کے نمائندہ نثر نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں اور اردو مکتوب نگاری میں ایک نئے اسلوب کے موجد شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مراسلہ نگاری کو مکالمہ نگاری بنایا اور اپنی شوخی و ظرافت سے اس میں نئے رنگ بھر دیے۔ غالب کی اپنی شاعری اور مکتوب نگاری میں ظریفانہ پہلو در حقیقت اپنے غم واندوہ کو چھپانے کے ردِ عمل میں سامنے آیا۔ انھوں نے اس میں نہایت چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔

غالب کے عمِ محترم کے چلے جانے کے بعد جب انھیں پتا چلا کہ خاندانی پنشن کی تقسیم میں ان کے ساتھ زیادتی برتی گئی ہے تو اس پنشن کو بحال کرانے میں انھوں نے اپنی انتہائی کوشش و محنت کی۔ یہاں تک کہ وہ کلکتہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ اس دوران وہ کئی لوگوں کے مقروض بھی رہے۔ غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بھی ذہنی بیمار تھے اور یہ بات مرزا کے لیے اضافی بوجھ بن گئی۔ مصائب اور مشکلات نے ہمارے شاعر کو اپنے گھیرے میں لیا لیکن مرزا غالب نے اپنی ہمت اور عالی ظرفی سے ان سب مصائب کا سامنا کیا۔ مزید بر آں غالب ایک بار چوسر اور جوا کھیلنے کے جرم میں گرفتار ہوئے اور انھیں چھے ماہ قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی لیکن آخر کار انھیں تین ماہ قید برداشت کرنا پڑی اور غالب جیسی شخصیت کے لیے یہ ایک انتہائی سخت بے آبروئی اور بدنامی کی بات تھی۔

جب ہم غالب کے ہم عصر شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں۔ ذوقؔ جیسے پر گو شاعر جو سراج الدین بہادر شاہ ظفرؔ کے استاد تھے اور انھیں ملک الشعرا کا خطاب حاصل تھا، یہ بات قابل غور ہے کہ غالب ملک الشعرا کے خطاب سے محروم رہے۔ باوجود اس کے کہ جتنی استحقاق اور قابلیت مرزا کو حاصل تھی، اس کے مقابلے میں خطاب کم تر درجے کے شاعر کو دیا گیا۔

غالب عرصۂ دراز سے اس کوشش میں تھی خاندانِ مغلیہ کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل کریں لیکن جب تک ذوقؔ درباری شاعر تھے تو مرزا کے لیے کوئی خاص مقام و مرتبت کی گنجائش کہاں نکلتی تھی۔ جب شیخ ابراہیم ذوق (متوفی ۱۲۷۱ھ) فوت ہوئے تو بہادر شاہ ظفر نے غالب کو خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا اور انھیں خطابات و اعزازات سے نوازا۔ جو کام مرزا کو سونپا گیا وہ اس کام سے زیادہ دلچسپی اور شغف نہیں رکھتے تھے لیکن مرزا نے کوشش کی کہ تاریخِ خاندان تیموریہ "مہر نیم روز" کو اپنی تخلیقی صلاحیت کی بدولت تحریر کریں۔

غالب کی زندگی میں ایک ناگوار حادثہ پیش آیا جو واقعۂ غدر یا جنگِ آزادی سے تعبیر کیا گیا۔ جب انگریز آقا ہندوستان پر قابض ہوئے تو ہندوستان کے باشندوں کے دل میں آزادی کے جذبات ابھرنے لگے اور انھوں نے کوشش کی کہ انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ اس دوران میں ہندوستانی آزادی خواہوں نے انگریزوں کی قتل و غارت اور لوٹ مار شروع کی اور کئی انگریز اس واقعے میں مارے گئے۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو اپنے فرماں روا کے طور پر قبول کیا لیکن انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے آزادی خواہوں کو شکست دی، اسی دوران غالب دہلی شہر میں پیرانہ سری اور کہولت کی عمر گزار رہے تھے اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ گھر میں محصور تھے۔ اس وقت غالب کے پاس دو کتابیں موجود تھیں ایک "دساتیر" اور دوسری "برھان قاطع"۔ غالب نے اس مدت میں برہانِ قاطع پر نظر ڈالی اور جہاں جہاں اس میں سقم اور غلطیاں انھیں نظر آئیں ضبطِ قلم کرتے گئے۔ جستہ جستہ یہ خود ایک کتاب بن گئی اور غالب نے بعد میں اس کا نام "قاطع برھان" رکھا لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد مخالفین نے اس کے خلاف مضامین اور کتابیں لکھیں اور غالب پر بڑی سخت تنقیدی رائے کا اظہار کیا۔ جنگ آزادی کے دوران غالب نے مسلمانوں اور ہندوستان پر برتی گئی زیادتی اور ظلم و ستم کے ضمن میں ایک کتاب لکھی لیکن انگریزوں کے خوف سے ایسا پہلو اختیار کیا جس میں انگریز سپاہیوں کی بھی داد دی جائے۔ بعد میں غالب نے اس کتاب کو جس کے مقدمے میں ایک قصیدہ درج تھا ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں پیش کیا۔

جب ہم غالب کی زندگی کے آخر برسوں پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ غالب چوں کہ مدت سے جسمانی بیماریوں کے شکنجے میں گرفتار تھے۔ اب وہ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے کمزور ہو چکے تھے اور قوت سماعت میں کافی فرق آ چکا تھا اور ان کی خوراک کم ہو چکی تھی، جسمانی بیماریاں غالب کے ناتوان جسم پر غالب آ چکی تھیں۔ آخر کار ۱۵/ فروری ۱۸۷۹ء کو اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ غالب نے اپنی زندگی میں رواداری اور خوش مشربی کو اپنا نصب العین بنایا اور کسی ایک فریق کو دوسرے گروہ پر برتری دینے کی کوشش نہیں کی۔ اب ہم اس باب میں مرزا غالب کے سوانح اور زندگی کے مختلف حوادث اور ان کی اردو فارسی تصانیف پر روشنی ڈالیں گے۔

غالب نے اپنی ابتدائی تعلیم آگرے میں شروع کی۔ ان کے استادوں میں جس طرح مولانا حالیؔ نے "یادگار غالب" میں بیان کیا ہے شیخ محمد معظم تھے جن سے انھوں نے فارسی سیکھی۔ غالب نے فارسی کی ابتدائی تعلیم کے ضمن میں ایک ایرانی استاد کا ذکر کیا ہے جو پارسی نژاد تھے، ان کا اصلی نام "ھرمزد" تھا جن کے مسلمان ہونے کے بعد ان کا نام "عبدالصمد" رکھا گیا۔ عبدالصمد دو برس غالب کے یہاں ٹھہرے۔ اس عرصے میں غالب نے ان سے فارسی زبان و ادب کے علاوہ پارسیوں کی مذہبی رسومات سیکھیں۔ چنانچہ غالب نے ذکر کیا

ہے۔ عبدالصمد علاوہ فارسی زبان کے عربی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ ایک جامع اللسانین استاد تھے جو غالب کو ملے۔ محققین کا خیال ہے یہ ایک فرضی استاد تھے جنھیں غالب نے اپنے لیے تراشا۔ مخالفین کے منہ بند کرنے کے لیے انھوں نے یہ کام کیا چوں کہ غالب اپنے اشعار میں فارسی زبان کی شاعری کو مبدأفیاض سے جانتے ہیں۔(۷)

آنچہ در مبدافیاض بود آن منست

گل جدا ناشدہ از شاخ بدامان منست

لارڈ لیک نے غالب کے چچا نصر اللہ بیگ کو ان کی خدمات کے صلے میں ۱۸۰۶ء میں سونک اور سونسا کے دو پرگنے دیے۔ نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد لارڈ لیک نے ان پرگنوں کو نواب احمد بخش خان کی ریاست میں ضم کر دیا اور مرحوم کے ورثا کے لیے ان کی آمدنی سے دس ہزار روپے سالانہ مقرر کیے۔ لیکن نواب احمد بخش خان نے لارڈ لیک سے ایک اور دستاویز حاصل کی جس کی رو سے یہ رقم نصف ہو گئی اور اس نئی تقسیم میں ایک شخص خواجہ حاجی کو بھی شریک قرار دیا اور اس رقم کی یوں تقسیم کی گئی۔

۱۔ خواجہ حاجی: دو ہزار روپیہ سالانہ

۲۔ نصر اللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنیں: ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ

۳۔ میرزا نوشہ اور میرزا یوسف برادرزادگانِ میرزا نصر اللہ بیگ مرحوم ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ(۸)

نواب احمد بخش خان نے جو دوسری دستاویز حاصل کی تھی وہ فارسی زبان میں تھی۔ جب غالب سنِ شعور کو پہنچے تو انھیں یہ علم ہوا کہ پنشن کے معاملے میں ان کے ساتھ ناانصافی برتی گئی ہے چوں کہ اس وقت کلکتہ حکومت کا مرکز تھا تو انھوں نے اپنی دادخواہی کے لیے ایک دور و دراز سفر کا آغاز کیا۔ غالب کب دہلی سے روانہ ہوئے، اس سلسلے میں صحیح تاریخ سامنے نہیں آتی۔ غالب تقریباً۱۸۲۶ء کے اوائل میں دہلی سے وہ لکھنؤ گئے اور وہاں کئی مہینے مقیم رہے۔ "مرزا ۲۷/ جون ۱۸۲۷ء کو بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور تین روز میں کانپور پہنچے۔"(۹) وہاں سے باندہ پہنچے اور انھوں نے تقریباً چھ ماہ وہاں قیام کیا۔ باندا سے وہ مودہ ہوتے ہوئے چلہ تارا پہنچے گئے، یہاں سے کشتی کے ذریعے الہٰ آباد پہنچے۔ وہ الہٰ آباد میں ایک دن قیام کے بعد بنارس گئے۔ بنارس میں چار ہفتے قیام کے بعد عظیم آباد کے راستے سے مرشد آباد پھر کلکتہ روانہ ہوئے اور آخرکار ۲۰/ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ میں وارد ہوئے۔(۱۰)

غالب جب الہٰ آباد پہنچے انھوں نے اس شہر کو اپنے مزاج کے مطابق محسوس نہیں کیا اور صرف ایک دن اس شہر میں قیام کیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے بنارس گئے، بنارس پہنچنے سے پہلے غالب کی طبیعت کافی خراب ہو چکی تھی اور وہ بیمار و علیل تھے لیکن انھیں بنارس کی آب و ہوا راس آئی، بنارس کی خوبصورتی کا جو سماں غالب اپنی مثنوی "چراغ دیر" میں باندھتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ غالب کو بنارس شہر بہت پسند آیا۔ اس شہر کی تعریف و تحسین میں "چراغ دیر" کی مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:(۱۱)

تعالیٰ اللہ بنارس، چشمِ بد دور

بہشت خرم و فردوس معمور
بنارس را کسی گفتا کہ چین است
ھنوز از گنگ چینش بر جبین است
بہ خوش پرکاری طرز وجودش
ز دھلی میر سد ھر دم درودش
بنارس را مگر دیدہ است در خواب
کہ میگردد ز نھرش در دھن آب
حسودش گفتن آئینِ ادب نیست
ولیکن غبطہ گر باشد عجیب نیست

جیسا کہ آپ نے مذکورہ بالا فارسی اشعار میں دیکھا کہ غالب نے اپنی اس مشہور مثنوی "چراغ دیر" میں کتنی خوبصورتی کے ساتھ دلکش انداز میں بنارس شہر کی ایک نہایت عمدہ تصور کھینچی ہے۔ غالب کی فارسی مثنویوں میں یہ مثنوی مرقع نگاری کا ایک بے مثال نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

غالب اپنے فارسی خطوط میں بھی قیام بنارس کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ ایک خط بنام محمد علی خان میں غالب اس شہر میں رہنے کی یوں خواہش ظاہر کرتے ہیں:

> ".....(اگر) یہ اہم مقدمہ پیش نہ ہوتا اور (میرا) دل شماتت اعدا سے زخمی نہ ہوتا تو بے درنگ دین کو خیر باد کہتا اور تسبیح توڑ ڈالتا اور (ماتھے پر) قشقہ کھینچتا اور (گلے میں) زنار ڈالتا اور اس ہیئت کے ساتھ گنگا کنارے بیٹھا رہتا تاوقتے کہ (میرے جسم میں) ہستی کے آلائش کی گرد دھل نہ جاتی اور میں ایک قطرے کی صورت دریا میں ضم نہ ہو جاتا۔ اس ارم آباد میں قدم رکھتے ہی بغیر کوئی دوا کھانے، نئے عوارض کی تکلیف جاتی رہی، بلکہ وثوق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک حد تک اصل مرض میں بھی افاقہ ہو گیا۔ روز مرہ کے مرکبات میں سے جس قدر بھی فراہم ہو جاتے ہیں، وہ حفظِ ماتقدم کے طور پر ہیں ورنہ اب نہ تو تلافیِ ماضی منظور ہے، نہ رعایتِ حال۔"(۱۲)

اس خط کے مندرجات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ غالب بنارس پہنچتے ہی اس شہر کو اپنے مزاج کے مطابق پاتے ہیں۔ غالب کی جسمانی کمزوری اور امراض میں بہتری رونما ہوتی ہے اور ان کی طبیعت میں سرور بشاشت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ قیامِ بنارس کے کچھ

عرصے بعد غالب نے سوچا کہ بنارس سے کشتی کے ذریعے کلکتہ کا سفر کریں چوں کہ وہ سمندری سفر کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے گھوڑے پر اپنا سفر جاری رکھا۔

پٹنہ اور مرشد آباد سے ہوتے ہوئے ۲۰/ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے وہاں انھوں نے شملہ بازار میں میرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک فراخ وکشادہ مکان دس روپے کرائے پر لیا۔(۱۳)

کلکتہ میں غالب کے دوست احباب بھی موجود تھے۔ علی اکبر خان متولی امام باڑہ ہوگلی تھے جن کے ملنے کے لیے غالب ان کے دولت کدے پر حاضر ہوئے۔ خاندانی پنشن میں سرکاری حکام میں مسٹر سائمن فریزر کا نام قابل ذکر ہے جو عریضے پیش کیے جاتے تھے۔ فریزر ان عرایض کو انگریزی میں ترجمہ کرکے اعلیٰ حکام کے حضور میں پیش کرتے تھے۔ فریزر غالب سے بڑے خلوص وپیار سے پیش آئے اور انھوں نے غالب کو عطر وپان بھی پیش کیے، پنشن کے معاملے میں غالب باوجود کڑی تگ ودو کے کامیاب نہ ہوئے۔ اس دور ودراز سفر سے اگرچہ غالب کو خاندانی پنشن کے قضیے میں پیش رفت تو حاصل نہ ہوئی لیکن یہ سفر ادبی لحاظ سے غالب کے تجربات میں بیش بہا اضافے کا باعث بنا۔

انگریزوں کے دور میں کلکتہ اپنے انتہائی عروج پر تھا، مغرب کے اختراعی ذہن کے باعث یہ شہر کافی ترقی کر چکا تھا۔ غالب کلکتہ سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ایک قصیدے میں اس شہر کی تعریف کی ہے۔ دخانی کشتیاں، ڈاک رسانی کا انتظام جس کے ذریعے غالب اپنے خطوط دوستوں کے لیے بھجواتے تھے۔ تار برقی کے ذریعے چند منٹوں میں خبر رسانی اسی طرح کی دوسری سہولیات نے کلکتے کو رونق بخشی تھی۔ کلکتے کی آب وہوا غالب کو راس آئی۔ کلکتے کے بارے میں غالب کے محسوسات کو شعر کو پیرائے میں ملاحظہ کیجیے:

یافت آیینۂ بخت توز دولت پرداز

ہلہ کلکتہ بدینِ حسن خدا ساز بناز

گل برافشان بہ گریبان چو حریف سرمست

جلوہ گر شو بہ نظر ھمچو عروس طناز

وقت آن است کہ پاییز تو گردد نوروز

وقت آن است کز انجام تو بالد آغاز

جوش آھنگ ہزار است تورا بانگِ سرود

موجِ نیرنگِ بھار است تورا رشتۂ ساز

سیر گاہی ست در اطراف تو گوئی کشمیر

روستایی ست ز اقصای تو گویی شیراز (۱۴)

غالب نے جس انداز سے کلکتے کی خوبصورتی کا وصف اشعار میں بیان کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں کشمیر اور شیراز کی خوبصورتی ماند پڑتی ہے۔ غالب نے مذکورہ بالا قصیدے کے علاوہ اپنے ایک فارسی قطعے میں بھی کلکتے کی یوں خصوصیات بیان کی ہیں:

حال کلکتہ باز جستم، گفت

"باید اقلیم ہشتمش گفتن"

گفتم "آدم بھم رسد دروی؟"

گفت "از ھر دیار واز ھر فن"

گفتم "این جاچہ کار باید کرد"

گفت "قطع نظر ز شعر و سخن" (۱۵)

غالب نے ان اشعار میں کلکتہ کو "اقلیم ہشتم" بتایا ہے جہاں ہر فن اور پیشے سے متعلق فن کار اس شہر میں مقیم ہیں اور فن و حرفت وصنعت کا بڑا چرچا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس شہر میں شعر وادب وسخنوری کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔ دراصل اس طرح کے جذبات اس ادبی معرکے کے ردعمل کے طور پر سامنے آئے اور ان کے بدخواہ اور مخالف لوگ انھیں زک پہنچانے کی کوششیں کرتے تھے۔

قیامِ کلکتے کے دوران غالب مختلف مشاعروں میں شریک رہے اور وہاں کے اہل علم وادب سے روشناس ہوئے۔ کلکتہ میں چونکہ قتیلؔ کے شاگرد اور پیروکار موجود تھے اور ان کے مرتبۂ استادی پر فخر کرتے تھے۔ لہٰذا انھیں قتیلؔ کی شاعری پر فخر تھا، لیکن غالب قتیلؔ اور دوسرے ہندوستانی فارسی شعرا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سوائے امیر خسرو کے۔ ظاہر ہے جن محافل ومجالس میں غالب شریک ہوتے تھے ان کے اکثر وبیشتر لوگ قتیلؔ کے پیروکار تھے اور ان لوگوں نے کوشش کی کہ غالب پر نکتہ چینی کریں اور انھیں زک پہنچائیں۔ اس کے علاوہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ نواب احمد بخش خان نے پنشن کے سلسلے میں خواجہ حاجی نامی شخص کو شریک قرار دیا تھا۔ کلکتہ میں اس وقت خواجہ حاجی کے سالے میرزا افضل بیگ خان بھی موجود تھے چونکہ وہ اپنے بھانجوں کی ہوا خواہی میں وکیل مقرر تھے۔ انھیں غالب پسند نہیں تھے اور وہ جابجا غالب کو شیعوں اور سنیوں کے درمیان رافضی مشہور کرنے میں مصروف تھے۔ میرزا افضل بیگ نے یہ بھی کہا کہ یہ غالب اپنا تخلص بدلتا رہتا ہے اور قتیلؔ و واقفؔ کو برا بھلا کہتا ہے۔ اس لیے کلکتے میں غالب کے خلاف دشمنی کا ایک طوفان برپا ہوا۔ قتیلؔ کے ہواخواہوں نے غالب کو تحقیر وتذلیل کا نشانہ بنایا اور ایک مشاعرہ برپا کیا جس میں غالب کے فارسی اشعار پر اعتراضات کیے گئے۔ اتفاق سے ایک محفل میں ہرات کا سفیر بھی موجود تھا اور انھوں نے غالب کی بھرپور حمایت کی چنانچہ غالب نے معترضین کے جواب میں ایرانی شعرا کے اشعار بطور سند پیش کیے۔ ان میں حافظؔ، سعدیؔ، ظہوریؔ کے اشعار شامل تھے۔ غالب نے اپنے فارسی خطوط میں اس محفل کی جزئیات بیان کی ہیں جس میں سے ایک پیرے کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

جزوی از عالمم واز ھمہ عالم بیشم

ہمچو موی کہ بتان راز میان برخیزد

اعتراض یہ ہے کہ "عالم" کلمۂ مفرد ہے، اس کے ساتھ لفظ "ھمہ" کی ترکیب درست نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے کہ عالم بذاتِ خود مجموعۂ اشیا ہے اور "چھار شربت" اور "نھر الفصاحت" میں اس (ترکیب) کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ لفظ "بیش" تاوقتے کہ اس کے بعد "تر" نہ لائیں، استعمال نہیں ہوتا۔ چناں چہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو (تنہا) لکھا جائے۔ "بیش تر" کہنا چاہیے، "بیش" تنہا نہیں کہا جا سکتا۔ مزید یہ کہ معشوق کی کمر پر بالوں کا اگنا عقلاً اور عادتاً۔۔۔" (قیاسی: محال ہے) دیگر یہ کہ بالوں کے یا سبزے کے اگنے کو "برخاستن" نہیں کہا جا سکتا۔" (۱۶)

ہر چند غالب نے اپنے اشعار کے صحیح ہونے کے لیے فارسی اشعار سنداً پیش کیے لیکن وہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہیں آئے اور انھوں نے دیگر اشعار پر نکتہ چینی شروع کی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ ان میں سے کچھ لوگ نواب سید علی اکبر خان کے پاس گئے اور انھوں نے یہ کہہ، دیا کہ غالب محفل کے آداب کا لحاظ نہیں رکھتے اور قتیلؔ کے خلاف زباں درازی کرتے ہیں۔ نواب نے غالب کی سرزنش کی اور انھیں یہ مشورہ دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ صلح کرو اور معذرت نامہ لکھ کے میرے پاس بھیجو تاکہ میں ان لوگوں کو دکھاؤں۔ غالب نے سید علی اکبر خان کی بات مانی اور ایک مثنوی "آشتی نامہ" جو بعد میں "بادِ مخالف" کے نام سے مشہور ہوئی نظم کی۔ اس مثنوی میں غالب اپنے فنِ بیان کی بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ پہلے انھوں نے اہلِ کلکتہ کی رضامندی کے لیے ان کی مدح گوئی کی ہے لیکن قتیلؔ کے حوالے سے وہ کبھی ان کو اہلِ زبان کے ساتھ موازنہ نہیں کرتے اور بیدلؔ، ظہوریؔ، طالب آملی، عرفیؔ اور نظیریؔ جیسے بڑے جید شعرا کی مدح گوئی کرتے ہیں۔ اگر پوری مثنوی غور سے پڑھی جائے تو غالب نے قتیلؔ کی شاعری پر طنزیہ انداز سے بات کی ہے:

مگر آناں کہ پارسی دانند

ہم برین عھد ورای وپیمانند

کہ از اھل زباں نبود "قتیل"

ھر گز از اصفھان نبود "قتیل"

لاجرم اعتماد رانسزد

گفتہ اش استناد رانسزد

کاین زبان خاص اھلِ ایران است

مشکل ما و سھلِ ایران است

سخن است آشکار و پنھان نیست

دھلی و لکھنو ز ایران نیست (۱۷)

ان اشعار کا جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ غالب نے ہر چند معذرت نامہ لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ کبھی قتیل کی بات کو سند نہیں مانتے اور ان کو صف اوّل کے شعرا میں شامل نہیں کرتے۔ آگے جا کر غالب معترضین کو خوش کرنے کی غرض سے خود پر قتیل کی برتری کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ دراصل ان کی انا کے بالکل برعکس ہے کہ وہ قتیل جیسے شاعر کو اپنے سے بہتر سمجھیں:

من کفِ خاک و او سپہرِ بلند

خاک را کی رسد بہ چرخِ کمند

وصف او حدِ چون منی نبود

مھر در خورد بہ چرخِ کمند

مرحبا ساز خوش بیانی او

حبذا شورِ نکتہ دانی او

نظمش آبِ حیات راماند

در روانی فرات راماند

نثر او نقشِ بالِ طاؤسست

انتخاب صراح و قاموست

پادشاھی کہ در قلمرو حرف

کردہ ایجاد نکتہ ھای شگرف (۱۸)

اس ادبی معرکے کے باعث غالب کی طبیعت آزردہ ہو گئی اس کے ساتھ ساتھ خاندانی پنشن میں رکاوٹ آ گئی، خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی۔ قیامِ کلکتہ کے دوران غالب مغرب کے صنعتی انقلاب سے زیادہ متاثر ہوئے لیکن کلکتہ میں ان کے بدخواہوں نے جو رویہ ان کے اتھ اختیار کیا اس سے ان کی نازک طبیعت پر اثر پڑا۔ یہاں ماحول سے مطمئن نہ رہے، مالی مشکلات و مصائب نے ایک طرف سے زندگی اجیرن کر دی، دوسری طرف بیوی اور بھائی مرزا یوسف کی فکر بھی تکلیف دیتی تھی، اس اثنا میں غالب نے یہ فیصلہ کیا کہ کلکتہ کو بدرود کہہ کر یہاں سے نکل جائیں۔ غالب نے تقریباً اٹھارہ مہینے کلکتہ میں قیام کیا۔ اس دوران میں انھوں نے اچھے برے حالات کا سامنا کیا۔ انھیں دہلی

کی طرف لوٹنا چاہیے تھا چنانچہ کلکتہ سے براہِ باندہ دہلی روانہ ہوئے اور ۲۹ر نومبر ۱۸۲۹ء دہلی پہنچے۔ ''نامہ ہائے فارسی غالب'' مرتبہ اکبر علی ترمذی میں اس سفر کے حالات وواقعات موجود ہیں۔

چنانچہ مولانا حالی نے ذکر کیا ہے کہ غالب کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کا شوق تھا۔ لیکن اس چوسر کھیلنے کی وجہ سے انھیں ایک سخت حادثہ پیش آیا۔ دہلی شہر میں اس وقت قمار بازی پر سخت پابندی تھی اور مختلف اخباروں میں اس نکوہیدہ عمل پر پابندی کے اشتہارات چھپتے تھے۔ بدقسمتی سے شہر کا داروغہ تبدیل ہوا اور انھیں غالب سے دشمنی ہوئی تھی چنانچہ قانون کے تحت پلیس ان مکانات پر چھاپہ مار سکتی تھی جن میں قمار بازی کا شبہ رہتا تھا۔ اس لیے پلیس نے اپنا بھیس بدل کر غالب کے گھر پر چھاپہ مارا اور زنان خانے سے ہوتے ہوئے غالب کو گرفتار کر لیا۔ یہ خبر شہر میں پھیل گئی اور مرزا غالب کے لیے بدنامی اور بے آبروئی کا باعث بنی کیوں کہ اس وقت تک شہر کے شرفا کے ساتھ یہ رویہ نہیں رکھا جاتا تھا اور ان کی لاج رکھتے تھے لیکن بدخواہوں اور بدطینتوں کی سازشوں کے باعث غالب اس جال میں پھنس گئے۔ چوں کہ اس وقت چوسر کھیلنے پر سخت پابندی عائد تھی اور قانون کے تحت کاروائی ہونی تھی۔ اس لیے شہر کے مجسٹریٹ نے غالب کو اس جرم کی چھے ماہ قید بامشقت کی سزا سنا دی۔ غالب کی تمام عزت اور رکھ رکھاؤ خاک میں مل گیا۔ غالب نے اپنے ایک فارسی مکتوب بنام تفضل حسین خان میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حالی نے ''یادگارِ غالب'' میں مذکورہ مکتوب کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ہم پیش کرتے ہیں:

> ''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں، باوجودے کہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے۔ میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سیشن جج باوجودے کہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا، مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی.....''(۱۹)

غالب نے اپنے فارسی خط بنام تفضل حسین خاں میں لکھا ہے کہ چھے ماہ قید بامشقت کی سزا کی آدھی میعاد گزرنے کے بعد مجسٹریٹ کو ان کے حال پر ترس آیا اور انھیں رہا کر دیا گیا۔ ظاہر ہے غالب جیسی شخصیت کے لیے قید کاٹنا بڑی مشکل اور بے آبروئی کا باعث بنا، اس لیے غالب نے دورانِ اسارت میں ایک ترکیب بند نظم لکھی جو سات بندوں پر مشتمل تھی اور انھوں نے اس نظم میں اپنی پوری اندرونی کیفیت سنا دی ہے، غالب سے پہلے مسعود سعد سلمان نے بھی اپنی حبسیات لکھی تھیں، دوسروں کے لیے قید و بند کی مصیبتیں گزارنا

بڑی فخر کی بات ہوتی تھی لیکن غالب جس حال میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ یہ ان کے لیے نہایت افسوس ناک بات تھی۔ یہاں تک کہ ان کے عزیز و اقارب اور احباب جو ہمیشہ غالب سے اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کرتے تھے وہ مرزا غالب کے خلاف بولنے اور اخباروں میں اشتہارات دینے لگے کہ ہمارا غالب سے کوئی نسبی اور دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔ اس کے بر عکس شہر کے بڑے عمائدین اور بہادر شاہ ظفر کی درخواست تھی کہ غالب کی سزا معاف کیا جائے لیکن دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے غالب کو تین ماہ جیل میں گزارنا پڑا۔ البتہ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جیل میں غالب کو سہولیات میسر تھیں اور ان کے دوست مصطفی خاں شیفتہ نے ان کا بڑا ساتھ دیا، گھر سے برابر مرزا کے لیے کھانے پینے اور پہننے کی ضروریات میسر تھیں۔ غالب نے اس ترکیب بند میں مصطفی خاں شیفتہ کی بڑی تعریف کی ہے یہ وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے مرزا کا بھرم رکھا اور ان کی دلجوئی کی۔ غالب کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:(۲۰)

خود چرا خون خورم از غم کہ بہ غمخواری من
رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ای ھست دراین شھر کہ از پرسش وی
پایۂ خویشتنم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خان کہ در این واقعہ غمخوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

اس ترکیب بند میں غالب نے اپنے غم و غصہ کا اظہار اس طریقے سے کیا ہے کہ قضا اور قدر اور اپنی بد نصیبی کی وجہ سے جیل اور قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے محبوس کیے گئے ہیں، انھوں نے اپنی بد قسمتی اور منحوس طالع کی شکایت کی ہے۔ دراصل غالب اس معاملے میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہراتے اور کسی کے خلاف گلہ وشکوہ نہیں کرتے۔ کبھی انسان پر بُرے وقت بھی آتے ہیں اور انسان ہمیشہ نفسیاتی طور پر صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور اپنی عالی ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اگرچہ غالب اس نظم میں اپنے غم واندوہ کا اظہار کرتے ہیں لیکن جہاں وہ پاسبانوں اور دوسرے ساتھی قیدیوں کا ذکر چھیڑتے ہیں تو اس میں ان کا لب ولہجہ بدلتا ہے اور وہ اپنی انانیت کا بھی اظہار کرتے ہیں۔ یہاں قید خانے میں اندر جانے کے لیے شاعر اپنے رتبے و مقام کے پیش نظر وہی کیفیت برقرار رکھتے ہیں جو انھیں پہلے معاشرے میں حاصل تھی۔ جاہ وجلال اور شوکت وعظمت، تیسرے بند میں اس طرح کی کیفیت موجود ہے۔(۲۱)

پاسبانان بہ ہم آئید کہ من می آیم
درِ زندان بگشائید کہ من می آیم
ھر کہ دیدی بہ درِ خویش سپاسم گفتی
خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم

جادہ نشناسم وزانبوہ شامی ترسم
راھم از دور نمائید کہ من می آیم
رھرو جادۂ تسلیم درشتی نکند
سخت گیرندہ چرا ئید کہ من می آیم

غالب قید و بند اور قیدیوں کی حالت پر غمزدہ ہیں اور اپنے ساتھیوں کے دکھ درد انھیں محسوس ہوتے ہیں چنانچہ انھیں خود سے زیادہ ان بے چاروں کے حالِ زار پر ترس آتا ہے۔ غالب جیل میں آرام وسکون محسوس کرنے لگتے ہیں کیونکہ انھیں فکر معاش نہیں ہے اور ان کی ساری ضروریات گھر سے بغیر روک ٹوک کے آتی ہیں۔ یہاں ایک ایسی موڑ پر جو خود شاعر کو بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ بے چارہ اور قابلِ رحم وہی لوگ ہیں جو قید و بند کی سزائیں کاٹ رہے ہیں۔ شاعر کے ذہن میں اور دل پر ان کے غم واندوہ نقش بستہ ہیں۔ (۲۲)

ہر کس از بندِ گران نالد و نا کس کہ منم
نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند
خوی خوش بھر مصیبت زدہ رنجی دگر است
رنجہ از دیدنِ رنج دگرانم در بند

اگر غالب قید خانے میں خوشی محسوس کرتے ہی اور انھیں صرف اپنے ساتھیوں کے دکھ درد محسوس ہوتے ہیں تو اس کے مقابلے میں انھیں یہ تکلیف محسوس ہوتی ہے کہ رہا ہونے کے بعد وہ کیسے اپنے احباب کے طعن و سرزنش سے رہائی حاصل کریں گے۔ انھیں ابھی یہ خوف ہے کہ ان کی تند و ترش باتوں سے وہ کبھی رہا نہیں ہوں گے۔ یہاں شاعر کے ذہن پر ایک دباؤ ہے اور وہ نفسیاتی اور اندرونی کرب سے گزر رہے ہیں اور ذہنی طور پر مضطرب اور بے چین ہیں۔(۲۳)

ھمدمان دارم امیدِ رھائی در بند
دامن از بعدِ رھائی تہِ سنگم نبود
جورِ اعدا رود از دل بہ رھائی، لیکن
طعنِ احباب کم از زخمِ خدنگم نبود
بہ شکافِ قلم از سینہ برون میریزم
بسکہ گنجائیِ غم در دلِ تنگم نبود

آخری بند میں غالب اپنے قیدی ساتھیوں کی بھرپور تعریفیں کرتے ہیں کیوں کہ وہ برابر انھیں حوصلہ دیتے ہیں اور ان کے غم و اندوہ کے بوجھ سے کم کرتے ہیں۔ غالب کو بھی اچھی طرح احساس ہے کہ ہم بند قیدیوں میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور ان کے غم و اندوہ سے آشنا ہیں۔

ھمدمان در دلم از دیدہ نھانید ھمہ

غالبِ غمزدہ را روح وروانید ھمہ

للّٰہ الحمد کہ در عیش ونشاطید ھمہ

للّٰہ شکر کہ با شوکت وشانید ھمہ

ھم در آئینِ نظر سحر طرازید ھمہ

ہم در تعلیمِ سخن شاہ نشانید ھمہ

چشم بد دور کہ فرخندہ لقائید ھمہ

شاد باشید کہ فرخ گھرانید ھمہ

ڈاکٹر آفتاب احمد اس ترکیب بند پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنا مجموعی خیال اور تاثریوں بیان کرتے ہیں:

"اس کے باوجود غالب نے اس نظم میں اپنے درد و غم کا اظہار وقار و ضبط کے ساتھ کیا نہ وہ جذباتیت کا شکار ہوئے، نہ غصے اور نفرت کا، شکایت کی تو صرف تقدیر کی اور دوستوں سے گلہ کیا تو مہر و محبت کے نام پر، انسانی اقدار کو اپنایا اور اپنے دل کے دروازے تمام اہلِ زندان پر کھول دیے اور وہ کمال جو فطرت نے انھیں ودیعت کیا تھا۔ اسی کو اپنا اعزاز و امتیاز سمجھا۔ نتیجہ یہ کہ غالب کی زندگی کے تاریک ترین دنوں کی یادگار نظم ان کی شخصیت کے روشن ترین پہلوؤں کی آئینہ دار بن گئی ہے۔

(۲۴)"

حکیم احسن اللہ خاں اور پیر شیخ نصر الدین عرف کالے میاں جو بادشاہ کے بھی مرشد تھے، کی وساطت سے غالب ۴/جون ۱۸۵۰ء کو ملازمتِ شاہی میں داخل ہوئے۔ بادشاہ نے غالب کو خطاب اور اعزازات سے نوازے اور خاندانِ تیموریہ کی تاریخ نویسی پر مامور کیا۔ مہر نیم روز میں غالب اس موضوع کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

"....وہ دن مبارکی کی وجہ سے سعدِ اکبر کے نام سے موسوم اور پنجشنبہ کے نام سے مشہور ہوا اور ۲۳/ شعبان ۱۲۶۶ھ مطابق ۴/جون ۱۸۵۰ء تھا.... شاہی کارکن مجھے بادشاہ کے حکم سے خلعت شش پارچہ سے آراستہ کر کے سلام گاہ میں لائے۔ دنیا و دین کے بادشاہ نے اس بخشش آئیں ہاتھ

سے کہ جس کی ہتھیلی ایسا دریا ہے کہ سات دریا اس کے مقابلے میں کفِ آب (جھاگ) ہیں۔ جگر گوشہ ہائے معدن یعنی جیغہ اور سر پیچ میرے سر پر باندھا اور رگِ جانِ ابر نسیاں یعنی موتیوں کی حمائل میری گردن میں ڈالی۔ نقیب مبارک سروش نے بادشاہِ ستارہ سپاہ کے ابر خامہ کی رگوں سے ٹپکے ہوئے موتی بساطِ بارگاہ کے گوشے پر بکھیر دیے۔ اور غالب سخن سرا کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب سے پکارا ـــ شاہان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا فرمان میرے نام صادر ہوا...''(۲۵)

جیسا کہ غالب نے لکھا ہے بادشاہ ظفر نے انھیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ اس سلسلے میں حکیم احسن اللہ خاں مختلف تاریخی کتب سے خاندانِ تیموریہ کے حالات نکالتے تھے اور غالب اپنی خاص طرزِ تحریر میں ان کو فارسی کے ڈھانچے میں ڈھالتے تھے۔ غالب نے اس تاریخ میں جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ بہت مشکل طرزِ اسلوب ہے جس میں اپنی ثقیل انشاء پردازی کے ذریعے ایک ایسا مرقع پیش کیا ہے جس کی مثال کم ہے۔ غالب کی کوشش تھی کہ اس تاریخ میں اپنے فنِ انشاپردازی کا مظاہرہ کریں۔ غالب نے خاندانِ تیموریہ کی تاریخ کے لیے ایک اچھا نام تجویز کیا اور وہ تھا ''پرتوستان'' اس تاریخ کے دو حصے مقرر کیے، پہلے حصے میں آغازِ خلقتِ انسان سے شہنشاہ نصیر الدین ہمایوں درج تھے جس کا نام غالب نے ''مہر نیم روز'' رکھا اور دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر شاہ سے لے کر سراج الدین بہادر شاہ ظفر تک کے واقعات لکھنے کا ارادہ تھا۔ کتاب کا پہلا حصہ تقریباً ۱۸۵۲ء میں پایۂ تکمیل تک پہنچ کر ۱۸۵۴ء کو چھپی لیکن دوسرا حصہ کبھی نہیں لکھا گیا چوں کہ پہلے حصے کے اختتام پر ایک طویل وقفہ پیش آیا جس کے بعد ۱۸۵۷ء میں غدر برپا ہوا اور سلطنتِ مغلیہ کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ دوسرے حصے کی لکھنے کی ضرورت کبھی پیش ہی نہیں آئی۔

برصغیر پاک و ہند کی سیاسی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس جنگ میں ہندوستانی قوم اپنے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور ایک انقلاب برپا ہوا۔ عارضی طور پر ہندوستانی قوم کو فتح نصیب ہوئی لیکن انگریزوں نے اپنی حکمتِ عملی کے بل بوتے انھیں شکست دی۔ اس عرصے میں بہت سے بے گناہ و بے بس بچے، جوان، بوڑھے شہید ہو گئے۔ دلی کی بربادی کی کہانی مدتوں تک سنائی جاتی تھی۔ غالب اسی دوران دلی میں رہتے تھے اور قلعۂ معلی کی ملازمت میں مصروف تھے لیکن جب یہ ہنگامہ برپا ہوا انھوں نے حالات کے پیش نظر اپنا تعلق قلعہ معلّی سے ختم کیا۔ دلّی آزادی خواہوں کے قبضے میں آ گیا اور بہت سے انگریز مارے گئے، اس بغاوت کے دوران غالب دلّی شہر سے نہیں نکلے، گھر میں مقید رہے ان کی بیگم حالات کے پیش نظر قیمتی سامان اور زیورات کالے میاں صاحب کے گھر میں کہیں چھپا دیے۔ اس بغاوت اور بے سروسامانی میں غالب نے یہ سوچا کہ جو واقعات اور حالات رونما ہو رہے ہیں ان کو قلمبند کیا جائے۔ لہٰذا انھوں نے ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱/ جولائی تک کے تمام واقعات یعنی پندرہ مہینے کے حالات قلمبند کیے۔ غالب نے اس مختصر روزنامچہ کا نام ''دستنبو'' رکھا، انگریزوں کو خوش کرنے کی غرض اور مصلحت کی رو سے اس ہنگامے کو انھوں نے ''رستخیز بے جا'' کہا۔ غالب

نے اپنے ذہن میں کیا سوچا ظاہر ہے ان واقعات کو لکھنے کے پس منظر میں کچھ مصلحتیں تھیں۔ غالب کو اپنی جان عزیز تھی ان کے خیال میں تین اہم مصلحتیں تھیں۔ پہلے یہ کہ انگریزوں کی حمایت میں روداد شہر لکھ کر اپنی جان بچائیں۔ دوسری بات اپنی پنشن بحال کروائیں کیوں کہ وہ بچپن سے سلطنتِ برطانیہ کے نمک خوار تھے۔ تیسری بات خطاب وخلعت پانے کا ارادہ تھا۔

ہر چند دستنبو میں واقعات وحالات تاریخی لحاظ سے اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں لیکن مصلحت اندیشی کی رو سے انگریزوں سے وفاداری کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ انقلاب ستاون کے دوران پریس پر پابندیاں عائد کی گئیں اور کتاب چھاپنے کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتاب انگریز حکام کی رائے کے بغیر نہیں چھپ سکتی تھی۔ غالب نے کتاب کے شروع میں ایک مدحیہ قصیدہ ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ غالب نے کتاب کے شروع میں ایک مدحیہ قصیدہ ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ غالب کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کہیں یہ کتاب ان کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔ کتاب کی زبان پرانی فارسی میں ہے اس میں کوشش کی گئی ہے کہ دساتیری الفاظ استعمال کیے جائیں جو اس وقت بلاد پارس میں بھی استعمال نہیں ہوتے تھے۔ جہاں تک غالب کی کوشش تھی عربی الفاظ کم استعمال کیے جائیں۔ مشکل دساتیری الفاظ کے معنی ان کے کہنے کے مطابق حاشیے میں درج کیے گئے ہیں۔ غالب انقلابِ ستاون کی کہانی شروع کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> "اس سال جس کا مادۂ تاریخ بہ رعایتِ تخرجہ "رستخیز بے جا" ہے اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ / رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ بمطابق ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء پیر کے دن ایک پہر گزرنے پر اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کے در و دیوار لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا، میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم ومفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے۔۔۔ ان مدہوش چابک سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رخ نہیں پھیرا۔"(۲۶)

اس ترجمے سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ غالب انگریزوں کی وفاداری کی وجہ سے یہاں مجبور نظر آتے ہیں اور بغاوت کرنے والوں کے خلاف باتیں سنا رہے ہیں۔ دستنبو میں غالب نے لکھا ہے کہ ان کی عمر باسٹھ برس کے قریب تھی۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے وہ اپنے خاندان کی حفاظت کرنے کے لیے پریشان تھے۔ ان کے بھائی میرزا یوسف کا گھر ان سے کافی دور تھا۔ وہ بھائی کے لیے بہت فکر مند تھے چوں کہ یوسف ذہنی مریض تھا۔ انھوں نے دستنبو میں اپنے بھائی کا یوں ذکر کیا ہے:

”بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں پاگل و دیوانہ ہو گیا۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شور و غوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے فاتر العقل مالک اور سارے ساز و سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔“(۲۷)

میرزا یوسف کے بیوی بچے واقعۂ غدر کے دوران شہر سے نکل گئے اور مرزا یوسف ایک بوڑھے نوکر اور نوکرانی کے ساتھ اکیلے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ ایک دن یہ خبر آئی کہ میرزا یوسف پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس اثنا میں غالب کو پریشانی کے عالم میں گورکن اور غسال کی فکر تھی۔ ان کے پڑوسیوں نے ان کی مدد کی اور بھائی کو عزت و احترام کے ساتھ دفنایا۔ یوسف نے تقریباً ساٹھ سال اس عالمِ فانی میں زندگی بسر کی۔ چنانچہ غالب نے ان کی یومِ وفات کی تاریخ یوں نکالی ہے:(۲۸)

زسال مرگ ستم دیدہ میرزا یوسف
کہ زیستی بہ جہان درزخویش بیگانہ
یکی در انجمن از من همی پژوهش کرد
کشیدم آھی و گفتم ”دریغ دیوانہ“

اسی طرح مرزا یوسف ۲۹ صفر بہ سال ۱۲۷۴ھ کو فوت ہوئے۔ پہلے غالب نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات و مصائب کا سامنا کیا۔ غدر کے دنوں میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کی جدائی نے انھیں زیادہ پریشان کیا۔ اپنے مستقبل کی فکر میں واقعات وحالات کو اس انداز سے قلمبند کیا تاکہ انگریزی حکومت کی طرف سے ان پر مقدمہ نہ چلایا جاسکے، دستنبو کی طباعت اور اشاعت کی طرف خاص طور پر توجہ دی۔ آخر کار دستنبو پہلی مرتبہ نومبر ۱۸۵۸ء میں مطبع مفید خلائق، آگرہ سے چھپی۔ غالب نے اس کا ایک نسخہ ملکۂ برطانیہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انگریزوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑھتے جا رہے تھے لیکن جنگ آزادی کے بعد بھی پنشن بحال نہ ہو سکی۔ اس لیے غالب دربارِ رامپور سے متوسل رہے۔ واقعۂ غدر سے پہلے غالب کے دربار رام پور سے تعلقات تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ دربار سے تنخواہ مقرر ہو جائے چنانچہ نواب یوسف علی خاں بہادر نے غالب کو رامپور آنے کی دعوت دی۔ غالب اپنے دونوں صاحبزادے یعنی باقر علی خاں اور حسین علی خاں جو میرزا نواب زین العابدین خاں عارفؔ کے حقیقی اولاد تھے اور اب غالب نے ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کی تھی رام پور روانہ ہو گئے۔ وہاں بڑی عزت و احترام کے ساتھ وہاں ٹھہرائے گئے، دربار رام پور سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر لی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعۂ غدر کے بعد سرکاری پنشن بند ہو گئی کافی تگ و دو کے بعد تین سال بعد ۱۸۶۰ء میں پنشن بحال ہو گئی اور تین سال کی رقم یک مشت انھیں ملی۔ اب غالب معاشی لحاظ سے سکوں سے زندگی گزار رہے تھے۔

انقلاب ستاون کے دوران غالب آشفتگی کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ اس مدت میں وہ خانہ نشین رہے سب سے پہلے وہ غدر کے واقعات و حالات لکھنے میں مصروف رہے جب دستنبو اختتام پر پہنچی۔ اس وقت غالب کے پاس صرف دو کتابیں تھیں۔ ایک "دساتیر" اور دوسری "برھان قاطع" ان کتابوں کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں تھی۔ غالب نے برہان قاطع تالیف محمد حسین تبریزی متخلص بہ برہان پر تنقید کی۔ "برھان قاطع" ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۲ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں گلکنڈہ میں مرتب ہوئی۔ یہ فرہنگ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مستند فرہنگ سمجھی جاتی تھی اور اس میں بہت سارے الفاظ کے معنی درج تھے۔ غالب نے اس فرہنگ کا مطالعہ کیا اور جہاں اس میں غلطیاں یا خامیاں نظر آئیں انھیں نشان زد کرکے اس پر تفصیلی نوٹ لکھتے گئے۔ جستہ جستہ یہ ایک کتاب بن گئی۔ اس کا نام غالب نے پہلے "قاطع برھان" رکھا۔ غالب برہان قاطع کی تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"رگاہ غم تنہائی زور آوردی برہان قاطع رانگریستمی۔ چون آن سفینہ گفتار ھای نادرست داشت و مردم راازراہ می برد و من آئین آموزگاری داشتم بہ پیروان خودم دل سوخت۔ جادہ نمایان ساختم تا بیراھہ نپویند۔ جامع لغات نہ بہ حسن معنی سری داردونہ بر جوہر لفظ نظری۔ رعایت لفظ سیومین و چارمین از ھر لغت و افزودن شمارۂ لغات بہر صورت پیش نھاد ھمت والای اوست... نہ درآن روش از برھم خوردن قائدۂ استخراج پروا دارد ونہ درین خواھش از اندراج یافتن مہملات ننگ۔ ھر مصدر لغتیست وھر کلمہ مشتق لغتی۔ صدرہ آن بنی کہ مصدری رابابرخی از مشتقات جلوہ داد وبہ افزودن بای موحدہ زائدہ سرتاسر دگربارہ نوردازھم کشاد..." (۲۹)

غالب برہان قاطع میں سے الفاظ کے معانی نکالتے تھے اور جہاں وہ معانی ان کے خیال کے مطابق ٹھیک نہیں نکلتے ان کے اصل معانی کی طرف رجوع کرلیتے تھے۔ دراصل اس زمانے میں غالب کی دسترس میں کوئی لغت موجود نہیں تھی وہ اپنے حافظے پر اعتماد کرتے ہوئے مثالیں دیتے تھے۔ یہاں ایک اہم بات پر زور دینا چاہیے کہ اگر برہان قاطع میں غلطیاں تھیں تو برہان قاطع کے مؤلف اپنی طرف سے ان الفاظ کے معانی نہیں لکھتے تھے بلکہ مختلف لغات جو ان سے پہلے لکھی گئی تھیں ان سے استفادہ کرتے تھے۔

برہان قاطع میں بہت سے دساتیری الفاظ شامل تھے۔ اس کے علاوہ وہ الفاظ بھی شامل تھے جو اس وقت اہل زبان استعمال نہیں کرتے تھے، ایک مصدر کے جتنے مشتقات اور اشکال موجود نہیں وہ سب کے سب شامل تھیں۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں غالب اپنی زندگی میں لغت نویسی کے کرب سے نہیں گزرے اور اس علم میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے کئی جگہوں پر جو غلطیاں نکالی ہیں وہ بجاہیں۔ جب "قاطع برھان" چھپی اس کے خلاف تنقیدی رویوں کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ چنانچہ کئی برسوں تک غالب ان لوگوں کی تنقید کا نشانہ بنتے رہے۔ قاطع برہان کی مخالفت اور تائید میں مختلف کتابیں لکھی گئیں اور یہ تنقیدی رویے اس مرحلے پر پہنچ گیا کہ بعض اوقات غالب کے نام مختلف ایسے خطوط موصول ہوتے تھے جن میں فحش و ناسزا اور گالیاں بھری پڑی تھیں۔ نہایت افسوس کی بات ہے

کہ جس شاعر اور نثر نگار نے پوری عمر اپنے کمالِ فن سے فارسی اور اردو میں نہایت اعلیٰ درجے کی تصانیف تخلیق کیں یکدم بعض جاہل اور نادان لوگوں کے تنقیدی رویوں اور ملامتوں کے نشانے بنتے رہے۔

انقلاب ستاون سے پہلے غالب نے دربار رام پور سے اپنے تعلقات قائم کیے۔ نواب یوسف علی خاں بہادر از راہِ استاد نوازی غالب کو رام پور آنے کی تین بار دعوت دی لیکن غالب مختلف مصروفیات کے باعث ٹالتے رہے۔ جب واقعۂ غدر ختم ہوا غالب کی خاندانی پنشن کا قضیہ چل رہا تھا۔ پنشن کے سلسلے میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی۔ غالب نے فیصلہ کیا کہ اپنے دونوں صاحبزادے یعنی باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے ساتھ رام پور چلے جائیں اور نواب کی خدمت میں حاضری دیں۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں، میرزا نواب زین العابدین خاں عارفؔ کے بیٹے تھے۔ جب عارف عنفوان جوانی میں فوت ہوئے تو غالب نے سوچا کہ ان کے بیٹوں کی کفالت قبول کر لیں۔ غالب کو عارف بہت عزیز تھے اور ان سے گہری محبت تھی۔ وہ فارسی میں بھی شاعر تھے اور میرزا غالب سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی وفات پر غالب نے اردو زبان میں ایک مرثیہ لکھا۔ اس مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہاں اے فلکِ پیر، جوان تھا ابھی عارفؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چہار دہم تھے مرے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد وستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور
گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش وناخوش
کرنا تھا جوان مرگ گزرا کوئی دن اور
نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور (۳۰)

سفر رام پور اور سفر کلکتہ میں غالب مختلف مصائب میں جکڑے رہے۔ اس کے علاوہ کثرت مے نوشی نے طبیعت کے توازن کو مضمحل کیا تھا اور غالب مختلف بیماریوں کے شکار رہے۔ قدرتِ سماعت میں کمی آگئی وفات سے پہلے ان کا چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ چنانچہ

مولانا حالی لکھتے ہیں وفات سے پہلے ان پر بے ہوشی طاری ہو چکی تھی اور کچھ دیر کے لیے افاقہ ہو تا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ حالی "یادگار غالب" میں تاریخِ وفات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آخر ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کی دوسری اور فروری ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں دنیا سے رحلت کی اور درگاہ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہ میں اپنے خسر کے پائیں مزار میں دفن کیے گئے۔"(۳۱)

روحِ مزار پر مہر مہدی مجروحؔ کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے:(۳۲)

رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد
اسد اللہ خاں غالب مُرد
کل میں غم واندوہ میں باخاطر محزون
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ
ہاتف نے کہا: "گنجِ معانی ہے تہ خاک"

https://tasdeeq.riphahfsd.edu.pk

# حوالے و حواشی


(۱) مالک رام۔ ذکرِ غالب۔ دہلی: مکتبۂ جامعہ دہلی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۵

(۲) غالب، میرزا اسد اللہ خان۔ دیوانِ غالب دہلوی۔ محمد حسن حائری (مقدمہ، تصحیح و تحقیق)۔ تہران: میراث مکتوب، ۱۳۸۶ھ ش، ص ۳۶۶

(۳) مالک رام۔ ذکرِ غالب۔ ص ۱۹-۲۰

(۴) غالب، میرزا اسد اللہ خان۔ دیوانِ غالب دہلوی۔ دکتر محسن کیانی۔ تہران: انتشارات روزنہ، ۱۳۷۶ھ ش، ص ۳۸۵

(۵) غالب، میرزا اسد اللہ خان۔ دیوانِ غالب دہلوی۔ محمد حسن حائری (مقدمہ، تصحیح و تحقیق)۔ ص ۳۷۵

(۶) پرتو روہیلہ۔ کلیاتِ مکتوباتِ فارسی غالب۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء، ص ۸۱

(۷) مرزا اسد اللہ خان غالب۔ کلیاتِ غالب فارسی (جلد دوم)۔ مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ لاہور: مجلس ترقی اردو، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵۵

(۸) مالک رام۔ ذکرِ غالب۔ ص ۳۲-۳۳

(۹) شیخ محمد اکرام۔ حیاتِ غالب۔ لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۹ء، ص ۷۵

(۱۰) ترمذی، سید اکبر علی۔ 'غالب کے سفر کی توقیت"۔ مشمولہ: نامہ ہائے فارسی غالب اردو ترجمہ۔ پرتو روہیلہ۔ کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۱۹۹۹ء، ص ۵۴

(۱۱) غالب، میرزا اسد اللہ خان۔ دیوانِ غالب دہلوی۔ دکتر محسن کیانی۔ ص ۳۱۶

(۱۲) پرتو روہیلہ۔ نامہ ہائے فارسی غالب اردو ترجمہ۔ کراچی: ادارۂ یادگارِ غالب، ۱۹۹۹ء، ص ۷۶-۷۷

(۱۳) شیخ محمد اکرام۔ حیاتِ غالب۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۰۹ء، ص ۷۸

(۱۴) غالب۔ قصیدہ ہائے غالب دہلوی۔ سومنات خیال، مقدمہ، تصحیح و تحقیق۔ دکتر محمد حسن حائری۔ تہران: مؤسسہ انتشارات امیر کبیر، ۱۳۸۱ھ ش، ص ۱۸۸

(۱۵) غالب۔ دیوانِ غالب دہلوی۔ مرتبہ دکتر محسن کیانی۔ تہران: انتشارات روزنہ، ۱۳۷۶ھ ش، ص ۳۸۹

(۱۶) پرتو روہیلہ۔ نامہ ہائے فارسی غالب اردو ترجمہ۔ ص ۱۵۷-۱۵۸

(۱۷) غالب۔ دیوان غالب دہلوی۔ مرتبہ دکتر محسن کیانی۔ ص ۳۲۸

(۱۸) ایضاً

(۱۹) مولانا حالی۔ یادگارِ غالب۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ۴۲

(۲۰) غالب۔ دیوان غالب دہلوی۔ مرتبہ دکتر محسن کیانی۔ ۴۵۴

(۲۱) ایضاً۔ ص ۴۵۳

(۲۲) ایضاً۔ ص ۴۵۴

(۲۳) ایضاً۔ ص ۴۵۵

(۲۴) ڈاکٹر آفتاب احمد۔ غالب آشفتہ نوا۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ء، ص ۱۴۵

(۲۵) پروفیسر سید عبدالرشید فاضل۔ مہر نیم روز (اردو ترجمہ)۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۹ء، ص ۸۷

(۲۶) رشید حسن خان۔ مشمولہ: غالب اور انقلاب ستاون۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۴-۱۲۵

(۲۷) ایضاً۔ ص ۱۴۳

(۲۸) میرزا اسد اللہ خاں غالب۔ کلیاتِ غالب فارسی۔ (جلد اوّل)۔ مرتبہ؛ سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۴

(۲۹) مرزا اسد اللہ خان غالب۔ درفش کاویانی۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲-۳

(۳۰) مرزا اسد اللہ خاں غالب۔ کلیاتِ غالب (اردو)۔ ترتیب و تدوین؛ ڈاکٹر محمد خاں اشرف و ڈاکٹر عظمت رباب۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۴-۱۲۵

(۳۱) خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگارِ غالب۔ نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰

(۳۲) سید عارف شاہ گیلانی۔ شہنشاہ سخن۔ کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۸